عبدالماجد دریاآبادی کی کامیاب انشاءپردازی کاراز

The Secret of Dariyabadi's Successful Essay writing

ڈاکٹرانصاری مسعوداختر جمال احمد

صدر شعبۂ اُردو، انکوش راؤٹوپے کالج جالنہ (مہاراشٹر) انڈیا

Abstract

Insha Pardazi (Essay Writing) is an art like any other art in which the same work is taken from the words as from the colors in the painting and from the instruments in the music.

Urdu prose has produced few "masters of style" like Shibli, Nazir, Azad in the nineteenth century and Abul Kalam Azad, Abdul Majid Daryaabadi, Hassan Nizami, Mehdi Afadi and Mullah Wahidi in the twentieth century.

Abdul Majid Dariyabadi's greatest virtue is that he has a unique and distinguished identity prose writers among his time and adopts words and phrases according to the occasion and place. Language, literature and ethics, in all respects, he was a reformer, insightful and architectural writer.

His writings are such that it has taught essay writing before and still have the power to teach today.

Abdul Majid Dariyabadi said to beginners: "It is my advice that if you want to learn scholarly and serious essay writing in a smooth manner, then learn from the books of Allamah Shibli Nomani.

انشاءپردازی دوسرے فنون کی طرح ایک فن ہے جس میں الفاظ سے وہی کام لیا جاتا ہے جو مصوری میں رنگوں سے اور موسیقی میں سُروں سے، ! موسیقی اور مصوری کے لیے قدرتی استعداد لازمی سمجھی جاتی ہے، انشاءپردازی میں اس کا ہونا ناگزیر نہیں معلوم ہوتا؛ اس لئے کہ ہم بول چال اور کاروباری تحریروں اور علمی مضامین میں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو انشاءپردازی کے فن کا سامان اور سرمایہ ہیں۔ انشاءپردازی کی حدبندی کرنا مشکل ہے، خصوصاً جب ہم ہر تعلیم یافتہ آدمی سے توقع کرتے ہیں کہ وہ گفتگو اور تحریر میں اپنا مطلب ومافی الضمیر خوبی اور وضاحت کے ساتھ ادا کرسکے لیکن جس زمانے میں صحیح اور مکمل تعلیم کا تصور لوگوں کے ذہن میں تھا ہر نوجوان کو زبان اور نظری علوم کے علاوہ موسیقی، مصوری، سپہ گری کے مختلف شعبوں اور چند صنعتوں میں اچھا مذاق اور معقول رائے رکھنے کا اہل بنانے کی کوشش کی جاتی تھی اور پھر بھی یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اُسے تمام علوم وفنون میں یکساں ملکہ حاصل ہو جائے گا۔ ملکہ اور مہارت حاصل کرنا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کا کام تھا، اُس وقت کا کام جب نوجوان کو اپنے ذوق واستعداد کے متعلق غلط فہمی ہونے کا کم سے کم امکان ہوتا تھا۔ آج کل ہم نے تعلیم کو بہت محدود کر دیا ہے، زبان اور چند علوم کے سوا کچھ نہیں سکھاتے۔ اِس سے بہت سے نتیجے نکلتے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر شخص جو لکھ سکتا ہے، انشاءپرداز کہلاتا ہے، اَور اگر کوئی اِس فن میں طبع آزمائی نہیں کرتا تو ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم کے باوجود وہ کورا رہ گیا!..... سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انشاءپردازی کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے، اِس سلسلے میں محمد یوسف نے لکھا ہے کہ :

> "انشاءپردازی اعلیٰ درجہ کی ادبی قابلیت کا نام ہے جس کو فصاحت وبلاغت کے بے مثل پیرایے میں اس طرح ادا کیا جائے کہ اگر تخیل کی تصویر کھینچنی منظور ہو تو اُس کی زندہ تصویر کا سماں آنکھوں کے رُوبرو پھر جائے،

فصاحت سے یہ مطلب ہے کہ الفاظ ثقیل، بھدّے اور غیر مانوس نہ ہوں اور قواعدِ صَرفی سے رُو سے صحیح ہوں ،اور روز مرّہ اور محاورہ کو اگرچہ جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے، لیکن در حقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فردِ خاص ہے۔ بلاغت اُسے کہتے ہیں کہ کلامِ فصیح مقتضائے حال کے مناسب ہو، اس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر خوشی اور فرحت کا موقع ہو تو سرور وانبساط کی روح پھونکی جائے، اگر غم واَلم کی داستان بیان کرنی ہو تو رنج ومصیبت کی تصویر کھینچی جائے، مگر اکثر مواقع ایسے آپڑتے ہیں کہ جہاں کلام کا نشتر دِل پر اُسی وقت کھٹکتا ہے جب کہ اس کو گوناگوں طریقہ سے تشبیہ، استعارے اور ضرب الامثال کے قالب میں ڈھال دیا جائے کیونکہ یہ چیزیں حُسنِ کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم ونثر میں تصویر اور تحریر میں جو کچھ جادو گری ہے بہت کچھ اِنہی کی بدولت ہے بشرطیکہ اِس میں اعتدال ہو، ورنہ اصل مضمون خاک میں مل جائے گا اور اور 'فسانۂ عجائب' اور 'پنچ رقعہ' کے مضامین کی طرح مقصود مبالغہ کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ جائے گا۔ اِس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ مثلاً کوئی اپنے بیٹے کے مر جانے پر بجائے یہ کہنے کے کہ "میرا عزیز بیٹا مر گیا" یا یوں کہے کہ " میری آنکھ پھوٹ گئی" یا "میرا گل مرجھا کر خاک پر گر گیا"۔ تو مضمون کہاں سے کہاں تک بلند ہو جاتا ہے۔
("آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد میں اُردو کا سب سے بڑا انشاء پرداز کون ہے؟ از م: محمد یوسف، مطبوعہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔ ص ۶ تا ۷)

اِسی طرح پروفیسر محمد مجیب، فنِّ انشاء پردازی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"انشاء پردازی ایک فن ہے، اور فن اُسی وقت وجود میں آتا ہے جب اُس کو کوئی شخصیت اپنے اظہار کا ذریعہ بنائے!

انشاء پرداز بننے کی پہلی شرط ادبی تعلیم وتربیت نہیں بلکہ شخصیت کی تعمیر ہے، یعنی اُن اُصولوں کی پیروی، جو اخلاقی تربیت کے لئے لازمی مانے جاتے ہیں۔ ادبی اوصاف اخلاقی اوصاف سے جُدا نہیں ہیں۔ یوں کہا جائے کہ صنّاع اور اخلاقی معلم کی طرح ادیب کو سچا، ایمان دار، مخلص، متین اور خوددار ہونا چاہئے! مگر اُس کی شخصیت میں اتنی قوت اور زور ہونا چاہئے کہ زبان کو اپنے رنگ میں رنگ دے اور الفاظ کی بے حِس مٹی میں جان ڈال دے!" ("انشاء، ادب اور ادیب": از پروفیسر محمد مجیب، ناشر اُردو گھر۔ دہلی، ص ۷ تا ۲۸)

اِسی طرح ضرب الامثال اور تشبیہات بھی ادب کی روح خیال کی جاتی ہیں جیسے "ہنوز دلی دوُر است"، "ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات"، "چھوٹا منہ بڑی بات" وہ جملے ہیں جن کے ذریعے بڑے سے بڑے مضمون کو باتوں ہی باتوں میں ادا کر سکتے ہیں، کبھی معشوق کے لئے 'گل'۔ زُلف کے لئے 'بنفشہ'۔ آنکھ کے لئے 'نرگس'۔ قاصد کے لئے 'بادِ سحر' لا کر کلام کو بہت بلیغ بنا دیتے ہیں، اِسی طرح کلیجہ پر سانپ لوٹنا، ہَوا سے باتیں کرنا، آسماں سے زمیں نپوانا وغیرہ، وہ جملے ہیں جن کے بغیر بعض اوقات انشاء پردازی کا حُسن وجمال قائم نہیں رہ سکتا۔

اِس حقیقت کو؛ کہ زبان دراصل خیالات ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے نظر انداز کرنے سے ہمارے ادب میں بہت سے عیب پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم کسی کی صورت یا سیرت، اپنے یا پرائے دِل کی کیفیت یا کسی منظر کی خوبیوں کا نقشہ کھینچنا چاہیں، یا کسی اَور کے کھینچے ہوئے نقشے کو غور سے دیکھیں؛ تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم بہت سے اسمِ صفت جمع کر دیتے ہیں۔ جس میں سے کسی ایک کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اَور نہ ہم بڑائی کرنے میں کوئی اندازہ قائم رکھ سکتے ہیں نہ بُرائی کرنے میں۔ حالانکہ اُردو زبان میں الفاظ کا اتنا ذخیرہ ہے کہ ہم ہر مطلب صحیح طور پر ادا کر سکتے ہیں اور نقص ومبالغے سے بچ سکتے ہیں۔ غلطی دراصل ہماری ہے کہ ہم الفاظ کی چھان بین نہیں کرتے، ہر اچھی چیز کو دلفریب؛ اور ہر بُری چیز کو "ناگفتہ بہ" کہہ کر بات ٹال دیتے ہیں اور مضمون چھپ جاتا ہے۔

اہل علم و نظر بخوبی جانتے ہیں کہ اُردو نثر نے صرف چند ہی "صاحبانِ اُسلوب" پیدا کئے ہیں، اُنیسویں صدی میں علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا محمد حسین آزاد اور بیسویں صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا آبادی، خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی اور مُلّا واحدی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی اُن باکمال ادیبوں میں سے ہیں جن کی عبارت میں فصاحت، بلاغت، جذبات اور فکر و خیال میں توانائی اور حکمت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر نثر نگاروں میں ایک منفرد اور ممتاز پہچان رکھتے ہیں اور موقع و محل کے مطابق الفاظ اور پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی نے پچاس سے زیادہ کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں، ہزاروں مقالات، پیغامات، خطوط اور تبصرے لکھے۔ ادبی مضامین اور مقالات کے کئی مجموعے اُن کی زندگی ہی میں "مجموعہ مضامینِ عبدالماجد" حیدر آباد سے۔ اُس کے بعد "مقالاتِ ماجد" کے نام سے بمبئی اور لاہور سے اور "انشائے ماجدی" کے نام سے کلکتہ سے شائع ہوئے۔ پھر ان کے انتقال کے بعد اُن کے جانشین اور بڑے بھتیجے حکیم عبدالقوی مرحوم نے ایک اعلیٰ مجموعہ "لطائف ادب" مرتب کیا جس کو کلکتہ سے ادارۂ انشائے ماجدی نے اور دارالکتاب دیوبند نے "عبدالماجد دریا آبادی کے ادبی شہ پارے" مرتبۂ سمیع الدین نظام آبادی (تین جلدیں) شائع کئے۔

عبدالماجد نے اپنے ہفتہ وار اخباروں "سچ"۔ "صدق" اور "صدقِ جدید" میں بالتزام بطورِ اداریہ "سچی باتیں" کے عنوان سے ایک کالم لکھنا شروع کیا جو اپنی حُسنِ انشاء، معنویت اور ادبی دلآویزی کی وجہ سے مقبول ہوئیں۔ اُن کی سچی باتوں کا ایک قابلِ نقل منتخب مجموعہ "انتخابِ سچی باتیں" کے نام متعدد جلدوں میں شائع ہوئیں۔ عبدالماجد دریا آبادی اِن مقالات کے مجموعوں یا مضامین کو انشائیہ کہنا بہت سمجھتے تھے جیسا کہ اُنہوں نے "مقالاتِ ماجد" کے مقدمہ میں ذکر کیا تھا۔ یہ انشائیے اُن کے منفرد اُسلوب کے بہترین نمونے ہیں اور اُردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی نے اپنی آپ بیتی میں ذکر کیا ہے کہ اُنھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی سے اوّلاً اخبارات اور پھر رسائل میں مضمون نگاری شروع کر دی تھی اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جلد شروع کر دیا تھا، اُن کی تصانیف اور مضامین کا ذخیرہ ہزاروں صفحات سے متجاوز ہے، اُن کی تصانیف اور تحریریں مختلف النوع ہیں اور شروع سے آخر تک اُن میں بہت کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ "اِکنّی"۔ "جانگھیا"۔ "ریل کا سفر"۔ "قرض"۔ "عدالت"۔ "ایک مثالی اسٹرائک"۔ "اتوار"۔ "موسم" اور "اٹھارویں دن" وغیرہ عبدالماجد دریا آبادی کے ایسے شاہکار انشائیے ہیں جو نہ صرف "اِسّے" کی مغربی تعریف پر پورے اُترتے ہیں بلکہ مشرق و مغرب کے کسی بھی انشائی ادب کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر "اِکنّی"۔ "جانگھیا"۔ "بابو جی" اور "اتوار" اُردو کے انشائی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی کے انشائیوں کے نمونے:

"اِکنّی"

"نئی دہلی سے ایک سرکاری اعلان: "اِکنّی" بطور قانونی سکّہ کے یکم جنوری ۱۹۶۴ء سے ختم کر دی جائے گی۔"

دُنیا کی ہر چیز کی طرح سکّوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ دینار، درہم۔ تنکہ۔ فلوس۔ دھیلی۔ پاؤلی، کو آج کون جانتا ہے اور آنہ اور پائی اور اَدھنا اور دُونّی اور پیسے اور گنڈا اور دھیلا اور کوڑی تو ہمارے آپ کے سامنے ہی مردہ ہوئے ہیں۔

"اِکنّی" کا شمار کوئی بہت پرانے سکّوں میں نہیں بلکہ زیادہ عمر لوگوں کو تو ابھی اُس کا اجراء یاد ہو گا۔ ۱۹۰۷ء ہی سے تو چلی تھی..... پہلے کوڑی اور پھر بعد کو دھیلے کا دَور ختم ہونے کے بعد اب غریب غرباء بلکہ متوسط الحال لوگوں کا بھی سب سے زیادہ محبوب اور مرغوب، کارآمد اور چلتا ہوا سکّہ یہی تھا۔ اور کتنی خوشگوار یادیں بچپن سے لیکر اب تک کی، نکل کے اِس چھوٹے سے سکّہ سے وابستہ ہیں..... ایک پلیٹ فارم ٹکٹ ایک آنے کا، اخبار کا پرچہ ایک آنہ میں، ریلوے ٹائم ٹیبل ایک آنہ میں، کباب روٹی کا ناشتہ ایک آنہ میں، لسّی کا گلاس ایک آنہ میں، چائے کی پیالی ایک آنہ میں، برف کی قلفی ایک آنہ میں، نمائش میں داخلے کا ٹکٹ ایک آنہ میں، قلی کی مزدوری ایک آنہ میں، یکہ کا کرایہ ایک آنہ عہ، غرض ہما شما کا حاجت رَوا ایک آنہ!

اشرفی اور سادرن اور گنّی جس طرح دیکھتے دیکھتے عنقا ہو گئیں، اُسی منزل کی طرف اِکنّی بھی چلی اور چند روز بعد بس اُس کا نام ہی سکّوں کی تاریخ میں باقی رہ جائے گا اور شکل شاید عجائب خانوں کی الماریوں کے اندر ہی نظر پڑے۔

غم اُس کے جانے کا نہ کیجئے۔ جو چیز آتی ہے جانے ہی کے لئے تو آتی ہے، خواہ جلد، خواہ بدیر، سوچئے یہ کہ بے شمار اِکنّیاں جو آپ کے ہاتھ سے نکلیں وہ کس مد میں اُٹھیں؟ موقعِ خیر پر یا اُس کے برعکس؟..... تلافی وتدارُک کا موقع تو انسان کی آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔" (ہفت روزہ صدقِ جدید، اگست ۱۹۵۳، ص ۲)

عبدالماجد دریاآبادی کے لکھے ہوئے انشائیوں کا دوسرا نمونہ ملاحظہ فرمائیں، جس کا عنوان ہے "جانگھیا":

"جانگھیا"

جانگھیا بھی لباسوں میں کوئی لباس ہے؟ محض رانیں ڈھکی ہوئیں۔ باقی ساری ٹانگیں کھلی ہوئیں۔ کسی بھی بھلے آدمی سے محض جانگھیا پہن کر باہر نکلنے کی فرمائش کیجئے، اُردو خط میں لکھا جائے تو عجب نہیں کہ وہ منہ نوچ لے۔ لیکن جانگھیا کے بجائے 'نیکر' کہہ بول دیجئے تو دیکھئے کہ معاً وہی گنوارپن فیشن زدگی میں تبدیل ہوا جاتا ہے...! اس لئے شاید اور محض اس لئے کہ "جانگھیا" دیسی ہے اور "نیکر" ولایتی!..... حالانکہ دونوں لفظوں کے مفہوم میں کیا فرق ہے، بجز اِس کے کہ ایک میں صاحبیت کی جھلک ہے اور دوسرے میں ہندوستانیت کی بُو! گلی ڈنڈا آپ کھلیئے تو وحشی ہیں، غیر مہذب ہیں۔ لیکن کریکٹ کے لئے بلا ہاتھ میں لیجئے تو معاً شائستہ ہیں، مہذب ہیں، کلچرڈ ہیں....،" (صدقِ جدید، اگست ۱۹۵۳، ص ۲)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات کی روشنی میں بقول ڈاکٹر تحسین فراقی؛ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عبدالماجد دریاآبادی کی تحریروں میں ہر جگہ آمد، سلاست، ایجاز واختصار، برجستہ اشعار اور مصرعوں اور صنائع وبدائع خصوصاً رعایتِ لفظی اور قافیہ پیمائی کا سلیقہ اور اعتدال سے استعمال اور شگفتگی کے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ فلسفہ ونفسیات اور ترجموں میں علمی زبان استعمال کرتے ہیں۔ عبرت اندوزی اور درد وغم کی مرقّع نگاری میں سوز وگداز سے مملو الفاظ اور ترکیبیں ہوتی ہیں۔ شگفتگی، انبساط اور جوش وخروش اور طنز ومزاح کے جذبات کے لئے جاذب نظر سُرخیاں، لکھنوی روزمرہ اور محاوروں کے مطابق چھوٹے چھوٹے جملے، برجستہ شعر یا مصرع اُن کے اندازِ بیان کو بڑا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

اُن کا خاص فن محمد حسین کے الفاظ میں نشتروں میں تلوار کی آبداری بھرنا تھا۔ اُن کے قلم میں عملِ تنویم کی طاقت تھی۔ اِس دعویٰ کے ثبوت میں اُن کے کچھ مضامین کی تمہیدوں کے مختصر اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ "ہم راستے میں جارہے تھے کہ پیر میں ایک پتھر کی ٹھوکر لگ گئی، 'چوٹ' آئی، درد واذیت محسوس ہوئی۔ پتھر بدستور اپنی جگہ جوں کا توں رہا۔ وہ نہ کراہا نہ اُس نے آہ کی۔ ہو نہ ہو پتھر اور ہماری بناوٹ میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔"

("ہم آپ": عبدالماجد دریاآبادی، ص ۱۸ ماخوذ عبدالماجد دریاآبادی احوال وآثار)

۲۔ سکندرِ اعظم اپنے زمانہ کا پُر ہیبت و جبروت بادشاہ ہے۔ قُرب و جوار کے علاقے سَر کر کے نظر اُٹھاتا ہے اور چشم زدن میں ایران، افغانستان اور شمالی ہندوستان کی بلند گردنیں اُس کے سامنے خم ہیں۔ کامیابیوں اور فتح مندیوں کے نشہ میں جھومتا ہوا نوجوان شہنشاہ اپنے وطن واپس آتا ہے۔ راستے میں تپ آتی ہے ایک سے بڑھ کر ایک اطبائے حاذقین ہم رکاب ہیں لیکن چند ہی روز میں دُنیا کو نظر آجاتا ہے کہ جس قوت نے ایک عالم کو تہہ و بالا کر رکھا تھا بالآخر موت سے وہ خود مسخر ہو کر رہی اور دُنیا جسے قوی ترین ہستی تسلیم کر رہی تھی اُسے اپنے سے قوی تر حریف مل گیا جس کے سامنے تمام اقبال پیمائیاں، ساری کشور کشائیاں، ساری حوصلہ مندیاں ہیچ ہو کر رہیں۔" (مبادیء فلسفہ، جلد اول: از عبدالماجد دریاآبادی، معارف پریس، اعظم گڈھ ص ۱۰۴)

مذکورہ بالا دونوں قتباسات عبدالماجد دریاآبادی کی کتابوں کی تمہیدوں سے لیے گئے ہیں اور اُن کی عبارت اور الفاظ اتنے دلکش اور دلچسپ ہیں کہ پڑھنے والوں کی ہمہ وقتی توجہ اُن ہی کی طرف رہتی ہے۔ اِسی طرح چند جاندار اختتامیوں کے اقتباسات بھی پیش ہیں جو اُن کی مختلف موضوعات پر لکھی گئی کتابوں سے ماخوذ ہیں:

۱۔ "مشرق کے بدنام سخن گو، اُردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دِل رکھتا تھا۔ تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا، تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی، تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا، شاید کسی کی رحمتِ بے حساب پر تکیہ کر کے، لیکن انہی غافلوں اور سرمستوں کو موت وانجام کی یاد دلا کر بھی خوب رُلایا، کسی کی عظمتِ بے پایاں کا خوف کر کے عجب کیا کہ خدائے آموزگار، اِس عالم کا ستّار اور اُس عالم کا غفّار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامنِ عفو و مغفرت کے سایہ میں لے لے اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے اپنی رحمتِ بے نہایت کے حساب سے، اپنے ہی کرمِ بے حساب کے حساب سے۔" (مقالاتِ ماجد: از عبدالماجد دریاآبادی، ص ۱۵۶)

۲۔ "اللہ کی بے شمار رحمت ہو اُس انشاپرداز کے قلم پر جس نے یوں گُدگدا، گُدگدا کر ہنسایا اور رُلایا۔ کتنے بگڑے گھران ہی تحریروں سے سُدھرے ہوں گے اور کتنے ظلمت کدوں میں انسانیت اور خداترسی کی شعاعیں ان ہی روزنوں سے پہنچتی ہوں گی اور افسانہ کے اجرِ بے حساب اور مزید بے انداز کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔" (حوالۂ سابقہ: ص ۱۵۶)

۳۔ "رحمت ہو اُن کی روحِ پاک پر۔ بزمِ سخن میں امیر بن کر رہے اور اقلیمِ تصوُّف و معرفت میں خسرو بن کر چمکے۔ زبان پر وہ قدرت کہ ایران کے اہلِ زبان اُن کی فارسیت کے قائل اور سلوک و فقر میں وہ مرتبہ کہ جو تذکرہ صوفیہ و سالکین اُن کے نام نامی سے خالی وہ خود ناقص و ناتمام۔" (حوالۂ سابقہ: ص ۱۵۶)

اِن اقتباسات میں گداز، رنج و غم، گریہ و رِقّت، دنیا کی فناپذیری اور عبرت اندوزی کی تاثر آفرینی کے لیے موزوں الفاظ، مترادفات، متضادات اور محاکات اور تلمیحات کے استعمال کا بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ عبدالماجد دریاآبادی کا قلم نہایت مؤثر اور عبرت انگیز مرقعے کھینچنے پر قادر تھا۔

اُن کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محلِ تحریر کے تقاضوں کے مطابق اپنے اُسلوب کو ڈھال لیتے ہیں۔ اُن کی ایک اور بڑی خصوصیت صحتِ زبان ہے۔ لُغت، روزمرہ اور محاورہ سے اُنھیں گہری دلچسپی تھی جو آخر عمر تک قائم رہی۔ ڈاکٹر تحسین احمد فراقی نے اس سلسلے میں خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "عبدالماجد دریاآبادی: احوال و آثار" میں لکھتے ہیں کہ:

"عبدالماجد دریاآبادی کو یونیورسٹی کے اساتذہ، خاص کر ریسرچ کرنے والوں سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ صحیح اُردو نہیں لکھ پاتے اور اپنی مادری زبان کا مطالعہ غیر ملکی زبانوں کے ضوابط اور اصولوں کے تحت کرتے ہیں جن سے اُن کے یہاں آمد کے بجائے آورد، سلاست اور روانی کے بجائے تصنع، خشکی اور ٹھس پن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے اور وہیں کے روزمرہ اور محاورے استعمال کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے قلم سے نکلی

ہوئی ہر تحریر میں بلا کی شگفتگی اور زندگی پائی جاتی ہے۔ دلچسپ اور انوکھے عنوانات دے کر وہ متنوع بلکہ بعض دفعہ متعارض و متضاد موضوعات پر بڑی فنکارانہ چابکدستی سے قلم اُٹھاتے اور قارئین سے داد حاصل کرتے تھے۔"

(عبدالماجد. ایک باکمال انشاپرداز: ص ۱۷)

منشی پریم چند کے انتقال کے بعد اُن کی شخصیت اور فن کا خلاصہ عبدالماجد دریابادی کی انشاءپردازی کے جلوے میں دیکھئے:

"کہتے ہیں افسانہ نام ہے ایک ممکن زندگی کی حکایتی مصوری کا، لیکن یہاں زندگی مترادف تھی صرف ہجر و وصال کے، صرف رُخ و خال کے، گویا انسانی زندگی اپنی ساری رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوجود کیا تھی؟ تھیٹر کے اسٹیج کی ایک آہ اور دنیائے عمل اپنی ساری وسعت و پنہائی کے باوجود کیا تھی؟ محفل مشاعرہ کی ایک واہ!

یہ رنگ تھے اور کچھ ایسے ہی ڈھنگ کے، کہ ایک گوشہ سے چپکے سے پریم چند نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کی کایا پلٹ کر گئے، آئے دبے پاؤں خاموشی سے، آتے وقت نہ شور ہوا نہ ہنگامہ، لیکن جب گئے تو یارانِ بزم کا انداز ہی کچھ سے کچھ تھا۔ جب تک رہے نہ کسی سے جھگڑے نہ کسی سے اُلجھے، شکل آپ دیکھتے تو سادہ، بات چیت کرتے تو سادہ تر پاتے، بس یہ معلوم ہوتا کہ شہر کے نہیں کسی قصبہ کے معمولی پڑھے لکھے آدمی ہیں اور زیادہ کرید، اگر آپ نہ کرتے تو یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ کس مذہب کے تھے، رہے اب تک تو یوں رہے اور گئے تو ایک جدید اسلوب کی بنیاد رکھ، صاحبِ طرز ہو کر یا "صاحب" کے محاورہ میں اپنا ایک مستقل "اسکول" چھوڑ کر۔" (عبدالماجد دریاآبادی ایک باکمال انشاپرداز: ص ۲۷)

عبدالماجد دریاآبادی کی تحریریں ایسی ہیں جو پہلے بھی انشاءپردازی سکھا چکی ہیں اور آج بھی سکھانے کی طاقت رکھتی ہیں اور "ادبِ عالیہ" کی تعریف اُن کی تحریروں پر صادق آتی ہے۔ زبان، ادب اور اخلاق۔ غرض ہر اعتبار سے وہ مصلحِ انشاءپرداز اور معمار ادیب تھے۔ مولانا ماہر القادری (مدیر الفاران، کراچی) اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی کتابوں اور تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور اُن کی خوشہ چینی کی ہے۔"

(ماہنامہ فروغ اُردو، لکھنؤ: عبدالماجد دریاآبادی نمبر، اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ ص ۱۸۰)

عبدالماجد دریاآبادی کی کامیاب انشاءپردازی کا راز یہ تھا کہ وہ جس موضوع پر لکھتے تھے اُس پر اُن کی گرفت پورے طور پر ہوتی تھی، اُن کی تمہید، سُرخیاں اور لفظی و معنوی دلآویزی پڑھنے والوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں غضب کی آمد، روانی، موزوں تلمیحات و دلکش محاکات، سچے جذبات کی عکاسی، سوز و گداز، عبرت آموزی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اُن کو لغت اور صحتِ زبان سے بڑی دلچسپی تھی، اِس بارے میں وہ اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم کہا کرتے اور اپنے معاصرین بلکہ چھوٹوں تک سے بھی ہمیشہ استفادہ کے لئے تیار رہتے۔ عبدالماجد دریاآبادی کے قلم سے نکلے ہوئے انشائیے اپنے منفرد اُسلوب کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے اور اُردو ادب میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ اُن کا ادیبانہ قلم تفسیر ہو یا صحافت، آپ بیتی ہو یا سیاحت، تاثرات ہو یا مکتوبات، وفیات ہو یا نشریات۔ غرض تحریر کے جس کوچہ میں قدم رنجہ ہوا، میرِ کارواں بن کر رہا۔!

عبدالماجد دریاآبادی کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا ماحول ملا تھا، والد صاحب کے معمولات کا مشاہدہ اور اپنے چچازاد بھائی کی وجہ سے انھیں بچپن ہی میں کثرتِ مطالعہ اور اخبار بینی کا چسکا لگ گیا تھا۔ جب بی اے میں پہنچ گئے تو لائبریریوں سے استفادہ کے علاوہ اپنے ذاتی خرچ سے بھی کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔

عبدالماجد دریاآبادی کی ادبی تربیت میں سب سے بڑا ہاتھ علامہ شبلی نعمانیؒ کا تھا، اس بات کا اعتراف خود انھوں نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ "ناقابل فراموش ادبی واقعات و شخصیات" اُن کا ایسا ہی اہم مضمون ہے جس میں انھوں نے متعدد قد آور ادبی شخصیات اور اُن کی کتب سے استفادہ و فیضان کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

"اپنے ہوش کی جب آنکھیں کھولیں تو سمجھئے کہ اس بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا، ادبی فضا پر حکمران اُس وقت دو شخصیتیں تھیں: ایک شبلیؔ دوسرے شررؔ۔ سنجیدہ علمی، فکری، واقعاتی قسم کے ادبیات کے فرماں روا شبلی نعمانی تھے، علی گڑھ کالج کے سابق استادِ عربی، الفاروق کے نامور مصنف اور بڑے بڑے اور اہم معرکہ کے مقالوں کے مقالہ نگار۔ اِن اُنگلیوں نے جب سے قلم پکڑنا سیکھا، روش اعظم گڑھ کے اِسی مردِ عظیم کی دل کو بھائی۔" ("نقوش" لاہور۔ فروری ۱۹۶۱ء ص ۵)

اُردو کے معروف نقاد احتشام حسین کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کچھ ایسا ہی اعتراف کیا ہے :

"شوق ایک تو طبعی اور ادھر مولانا شبلی کی زندگی دل میں رچ بس گئی، انھیں کی اُنگلی پکڑ کر قلم پکڑنا سیکھا اور برسوں مچل مچل کر اُنھیں کی نقّالی کی، پھر جب ادبی جوانی پر پہنچ گیا تو ایک دَور آور آیا اور اب ہادی ءراہ مرزا محمد ہادی بنے، وہی امراؤ جان ادآؔ والے رُسوا۔ معلمِ اول شبلی تھے تو یہ معلم ثانی۔" ("نقوش" لاہور۔ فروری ۱۹۶۱ء ص ۵)

یقیناً بعض دلوں میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ یہ لکھنے لکھانے کا فن آخر عبدالماجد دریاآبادی نے کس سے سیکھا اور کب سیکھا؟ اس سوال کا جواب اُن ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں کہ :

"اصل اور صحیح جواب یہ ہے کہ کسی سے بھی اور کبھی بھی نہیں سیکھا، اور حقیقی معنی میں بالکل بے اُستاد ہوں۔ نہ کسی کی شاگردی اختیار کی، نہ کسی سے اصلاح لی، لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے مختلف دوروں میں متاثر بہتوں کی تحریروں سے رہا ہوں، اور شعوری و لاشعوری تقلید خدا معلوم کتنوں کے قلم کی کی ہے، بالکل بچپن میں یہ اثر مولوی احسان اللہ عباسی چریا کوٹی ثم گورکھپوری تک محدود رہا، پھر نمبر مولوی ثناءاللہ امرتسری، مولوی حکیم نورالدین احمدی اور مولوی نذیر احمد دہلوی کا آیا۔ اس کے بعد دور خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خان اور مولوی عبداللہ عمادی کا رہا۔ اور محض ادب و زبان کی حیثیت سے قائل محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، منشی سجاد حسین، راشد الخیری، ریاض خیر آبادی، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، محمد علی، سید محفوظ علی اور خواجہ حسن نظامی کا رہا ہوں۔ خیر یہ تو سب میرے بڑوں میں ہوئے۔ برابر والوں کا اثر کچھ نہ کچھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مودودی، مولانا عبدالباری ندوی اور جہاں تک محض ادب و انشاء کا تعلق ہے، قاضی عبدالغفار، سید ہاشمی فرید آبادی کا قبول کیا ہے، بلکہ چھوٹوں میں بھی رشید احمد صدیقی کا، اس وقت نام خیال میں یہی آرہے ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ضرور ہوں گے۔

پھر بھی اگر کسی کے لئے لفظ استاد کا اطلاق کر سکتا ہوں تو وہ بلاشک و شبہ مولانا شبلی تھے، اُن کا ممنونِ احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں، لکھنا لکھانا جو کچھ بھی آیا اُن کی نقالی میں آیا۔ برسوں اُن کا چربہ اُتارتا رہا ہوں، اُن کے فقرے کے فقرے، ترکیبوں کی ترکیبیں نوکِ زبان تھیں، اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، حُسنِ ترتیب صفائے بیان اُن کا حصہ تھا۔

اب بھی میرا مشورہ مبتدیوں کے لئے یہی ہے کہ ہر علمی، سنجیدہ مضمون نگاری اگر سلیس انداز میں سیکھنا ہے، تو مولانا ہی کی کتابوں سے سیکھئے،.... شبلی کے بعد اگر زبان کسی سے میں نے سیکھی ہے تو اِن حضرات سے، مرزا محمد ہادی رُسوا، مولوی نذیر احمد دہلوی، اور سرشار لکھنوی اور ریاض خیر آبادی۔ دونوں آزادوں (محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد) کے رنگ و انشاء کی داد میں نے بارہا دی ہے، فقروں، ترکیبوں پر جھوم جھوم گیا ہوں، لیکن اس ساری داد و تحسین کے باوجود اُن کے رنگ کی تقلید کی ہمت نہ ہوئی، اور اگر کبھی کچھ کرنا چاہی تو نبھ نہ سکی۔ اِن پُر شکوہ عبارتوں میں خاصہ رنگ تکلف کا نظر آیا۔ اپنا جی اُن تحریروں پر لوٹ ہوتا رہا۔ جو سلیس، سادہ، بے تکلف، رواں، سبک، بے ساختہ ہوں۔"

(آپ بیتی، عبدالماجد دریاآبادی، ص۳۰۸)

References:

1- Insha, Adab Aur Adeeb by Prof. Mohammad Mujeeb, Delhi
2- Ham Aap by Abdul Majid Dariyabadi
3- Abdul Majid Dariyabadi : Ahwal-o- Asar by Dr. Tahseen Ahmed Firaqi
4- Mabadi-e- Falsafa by Abdul Majid Dariyabadi
5- Maqalat-e-Majid by Abdul Majid Dariyabadi
6- Abdul Majid Dariyabadi : Ek Baakamal Inshapardaz by Abdul Aleem Kidwai
7- Aap Beeti by Abdul Majid Dariyabadi
8- Abdul Majid D. ke Adabi Shahpare by Sameeuddin Nizamabadi

Journals etc.

1- Weekly Sidq-e- Jadeed ,Lucknow, Aug. 1953
2- Monthly Nuqoosh, Lahor , Feb.1961
3- Monthly Farog-Urdu, Lucknow , Spl. No. on Abdul Majid D. Aug. to Oct. 1971